⊙ ڈاکٹر تحسین بی بی
صدر شعبہ اردو، ویمن یونیورسٹی، صوابی

غلام عباس کے افسانوں میں سیاسی شعور

Abstract:

Ghulam Abbas is one of the great fiction writers of his time. We can see the great impacts of development in his writings. We see great political and social awareness in his writings. He describes social weaknesses, problems and issues of common people. There are political, social, economical and psychological facts in his all the three collections of fiction writings. Mostly his writings provide political awareness which is described in this article in its full length.

Keywords:

Ghulam Abbas Political Consciousness Short-story Fiction

غلام عباس (۱۹۰۹ء۔۱۹۸۲ء) اپنے دور کا ایک بڑا افسانہ نگار ہے۔ انھوں نے افسانہ لکھنے کا آغاز (۱۹۲۵ء) ایسے زمانے میں کیا تھا جب اردو افسانہ انگریزی، روسی اور فرانسیسی کے جدید ادب میں ترقی پسند تحریک کے زیر اثر ادب ترقی کر چکا تھا۔ اس لیے ان کے افسانوں پر ترقی پسندی کے گہرے اثرات ہیں۔ غلام عباس کی اپنے زمانے کے بدلتے ہوئے تناظر و حالات پر گہری نظر تھی کیونکہ نوآبادیاتی نظام کی یلغار اور سرمایہ داری کی مضبوط ہوتی گرفت کے اندر تڑپتی و سسکتی انسانیت کا انھوں نے نہایت باریک بینی سے مشاہدہ کیا۔ غلام عباس ایک بڑے حقیقت نگار بھی ہیں۔ ان کے ہاں بیک وقت نیچرل ازم اور حقیقت پسندی کے رجحانات پائے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں نیچرل ازم اور سرئیل ازم کی ایک امتزاجی کیفیت موجود ہے اور ان دونوں تحریکوں کو ایک جگہ کر کے غلام عباس نے افسانہ نگاری کے ذریعے تصویر مکمل کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ غلام عباس کی پوری انسانی زندگی اور معاشرے پر گہری نظر تھی اس لیے انہوں نے ناہموار معاشرے کے نظامِ اقدار کی تصویر کشی نہایت عمدگی سے کی ہے۔ انھوں نے اپنے افسانوں کے موضوعات عام زندگی سے چنے اور معاشرے کی موجودہ صورتحال میں لوگوں کی مجبوریوں اور تلخیوں کی صورت دکھائی۔ بقول ڈاکٹر جمیل جالبی:

> ''غلام عباس نے مسائلی افسانے نہیں لکھے۔ بلکہ ان انسانی صورتحال (Situations) کی کہانیاں لکھی ہیں جو آفاقی اور ابدی ہیں۔ اس لیے ان کے افسانے وقت کے ساتھ اپنی دلچسپی نہیں

کھوتے، بلکہ اسی طرح تروتازہ اور زندہ رہتے ہیں۔''(۱)

غام عباس کے افسانوں میں اپنے عہد کا گہرا سیاسی وسماجی شعور موجود ہے۔ وہ اپنے افسانوں میں معاشرے کے کمزور پہلوؤں اور عام انسانوں کی مشکلات، الجھنوں کی عکاسی کرتے ہیں۔ ترقی پسند تحریک کے زیر اثر ان کی کہانیاں زندگی کے مادی مسائل کا کھلا اظہار ہیں۔ غلام عباس نے معاشی استحصال، ظلم کی مختلف صورتوں، اور مفلسی وکمزور انسانوں کی بے بسی کو اپنے افسانوں میں سمویا ہے۔ سویا مانے یاسر کے نزدیک:

''عام انسانوں کی بے بسی کا ذکر ہی غلام عباس کے افسانوں کا ایک اہم موضوع قرار دیا جاسکتا ہے۔''(۲)

غلام عباس نے اپنے افسانوں کے موضوعات عام زندگی سے چُن کر معاشرے کی موجودہ صورتحال میں لوگوں کی مجبوریوں اور تلخیوں کو اپنے مخصوص دھیمے لہجے و انداز میں بدل دینے کا خواب دکھایا ہے۔ غلام عباس کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے کہانی کو بلند سطح سے گرنے نہیں دیا۔ ان کے اکثر افسانوں میں ترقی پسندی کے مارکسی نظریے کی گونج سنائی دیتی ہے۔ لیکن نظریہ ان کے یہاں کہیں بھی فن پر حاوی نہیں ہو پاتا۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے بقول:

''وہ ادب میں مقصدیت کے قائل بھی رہے اور نرم لہجے میں اس کے مبلغ بھی لیکن صحافتی پروپیگنڈے اور تخلیقی ادب میں ہمیشہ فرق کیا۔ نتیجتاً ان کے افسانوں میں زبان وبیان یا فکر وخیال کی سطحیت کی منزل اور کسی دور میں بھی پیدا نہیں ہونے پائی جو تخلیق کو اپنے منصب سے نیچے لے آتی ہے۔''(۳)

غلام عباس نے حقیقت نگاری کی جو صورت اختیار کی ہے اس میں بے باکی اور انقلابی جذبے کی جگہ ان کا دھیما پن اور مدہم احتجاج و تلخ حقیقت نگاری ہے۔۔ ان کے افسانوں میں سکون، اطمینان اور مستقل مزاجی کی خصوصیتیں نمایاں ہیں۔ غلام عباس کے ابتدائی افسانوں سے ہی ان کی سوجھ بوجھ اور فنی چابکدستی کا احساس نمایاں ہوتا ہے۔ انہوں نے معمولی واقعات کو بھی زندگی کی پر پیچ حقیقتوں کے ذریعے پیش کرنے کوشش کی جو کہ بعد میں نکھر کر سامنے آئی۔ غلام عباس کا پہلا طبع زاد افسانہ 'قربانی' (۱۹۲۸ء) ہے۔ غلام عباس کی شہرت کا سبب بننے والا طویل افسانہ 'آنندی' (۱۹۳۹ء) ہے۔ جو کہ غلام عباس کے فن کا کلید بھی ہے۔ 'آنندی' حقیقت نگاری کا شاہکار ہے۔ پروفیسر عبدالمغنی اس افسانے کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

''آنندی بہت مشہور افسانہ ہے اور تنقیدوں میں اس کے حوالے آتے رہے ہیں۔ چنانچہ اس کے مصنف، غلام عباس کی پہچان بالعموم اسی حوالے سے کی جاتی ہے۔ بلاشبہ یہ افسانہ نہایت فنکارانہ اور فکر انگیز ہے۔ اس میں صرف ایک واقعہ اس تسلسل، تفصیل اور ترتیب سے بیان کیا گیا ہے کہ قصے کا ارتقاء گویا اپنے آپ ہو گیا ہے۔''(۴)

یہ افسانہ ترقی پسند تحریک کے زمانہ عروج میں شائع ہوا، اس لیے اس پر اس تحریک کے گہرے اثرات ہیں۔ اس افسانے میں مصنف کا مافی الضمیر اور معاشرے پر اس کا طنز ابھر کر سامنے آتا ہے۔ یہاں خیر وشر کے فلسفے کو نئے انداز سے

پیش کیا گیا ہے۔ یہ افسانہ اجتماعی لاشعور کی اچھی مثال ہے۔اس افسانے میں ایک اخلاقی، سماجی و سیاسی مسئلے کو پیش کیا گیا ہے اور وہ مسئلہ طوائفوں کا ہے۔اس افسانے میں ایک ریڈ لائٹ ایریا کا واقعہ بیان کیا گیا ہے۔جس میں مرکزی حیثیت شہر کو حاصل ہے۔شہر کے اندر ایک سماجی مسئلہ ابھرتا ہے۔اس کو حل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔اس پورے افسانے میں غلام عباس نے معاشرے کو واحد کردار کے طور پر خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔اس افسانے میں معاشی نقطہ نظر سے امرا اور دولت مند معاشرے کے دوسرے طبقوں پر اثرات کو بیان کیا گیا ہے اور غلام عباس نے یہاں ماضی کی غلام گردشوں میں سیر کرنے کے بجائے زمانۂ حال کو اپنے مشاہدے کی جولاں نگاہ بنایا ہے۔لیکن اختتام پر مستقبل کا سہرا ماضی کی طرف موڑ کر زندگی کا دائرہ مکمل کر دیا ہے۔ ڈاکٹر صادق، غلام عباس کے اس لطیف افسانے کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''آنندی اردو زبان کا ایک بے مثال افسانہ ہے، جسے بجا طور پر ایک ماحولی افسانہ کہا جا سکتا ہے۔ اس میں مرکزی کردار کے طور پر کسی شخص کے بجائے ایک پورے طبقے کو پیش کیا گیا ہے۔ یہ افسانہ بادی النظر میں جتنا سلیس دکھائی دیتا ہے۔اتنا نہیں ہے۔اس میں علامتی تہہ داری ہے۔سماج کے جھوٹے مہذب کردار پر بالواسطہ گہرا طنز ہے۔ پورا افسانہ paradoxical staire کی بنیاد پر استوار ہے۔''(۵)

غلام عباس کے زیادہ تر افسانے متوسط اور نچلے متوسط طبقے کی عکاسی کرتے ہیں۔غلام عباس اردو کا واحد افسانہ نگار ہے جس نے افسانہ نگاری کو اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا تھا۔اس کے تمام افسانے زندگی کے حقائق اور گہرے مشاہدے پر مبنی ہیں۔بقول شہزاد منظر:

> ''غلام عباس بنیادی طور پر حقیقت نگار تھے۔اس لیے انہوں نے زندگی بھر حقیقت نگاری کے دامن کو مضبوطی سے تھامے رکھا۔اور معاشرے میں جو برائیاں اور اچھائیاں دیکھیں انہیں ہو بہو پیش کرنے پر اکتفا کیا۔''(۶)

غلام عباس کے تین افسانوی مجموعوں آنندی (۱۹۴۸ء)، جاڑے کی چاندنی (۱۹۶۰ء) اور کن رس (۱۹۶۹ء) میں شامل اہم افسانے 'آنندی'، 'کتبہ'، 'اوور کوٹ'، 'جواری'، 'سمجھوتہ'، 'سرخ جلوس'، 'چکر'، 'رینگنے والے'، 'سیاہ و سفید'، 'بردہ فروش'، 'اوتار'، 'لچک' اور 'دھنک' وغیرہ ایسے افسانے ہیں جن میں غلام عباس کے سیاسی و سماجی شعور کے ساتھ ساتھ حقیقت نگاری کے مرقعے نظر آتے ہیں جن میں سماجی سیاسی، معاشی اور نفسیاتی حقیقت نگاری شامل ہے۔غلام عباس کے افسانوں میں سیاسی شعور کی عکاسی براہ راست نظر نہیں آتی بلکہ وہ حقیقت نگاری کے لبادے میں اپنے فن کا اظہار کرتے ہیں غلام عباس کے نزدیک:

> ''ترقی پسند افسانہ نگاروں کو کسی سیاسی و سماجی منشور کا پابند نہیں بنایا جا سکتا اور کسی سیاسی گروہ سے ناوابستگی سے مراد سیاسی شعور کی عدم موجودگی نہیں ہے۔نہ کوئی کہانی سیاست سے کلیتہً عاری ہو سکتی ہے۔''(۷)

ایک انٹرویو میں غلام عباس اپنے فن کے حوالے سے کہتے ہیں:

''میری چیزیں ترقی پسندانہ ہیں۔لیکن میں نے لیبل لگانا پسند نہیں کیا۔''(۸)

غلام عباس کا افسانہ 'رینگنے والے' سیاسی موضوع کا افسانہ ہے۔اس افسانے میں جلیانوالہ باغ کے سیاسی واقعے اور ردعمل کے طور پر نافذ ہونے والے مارشل لاء کو موضوع بنایا گیا ہے:

''اسی روز شام کو یہ بہت بُری خبر سننے میں آئی کہ فوج نے جلیانوالہ باغ میں نہتے لوگوں پر گولی چلا دی جس سے ہزاروں کی تعداد میں لوگ مارے گئے یا زخمی ہوئے۔ان میں جوان بھی تھے، بوڑھے بھی اونچے بھی اور پھر ان میں زیادہ تر وہ دیہاتی تھے جو بے چارے جلسے میں شامل ہونے نہیں بلکہ صرف سیر تماشے کے لیے وہاں گئے تھے۔اس کے ساتھ ہی شہر میں مارشل لاء لگا دیا گیا اور یہ حکم دے دیا گیا کہ کوئی شخص شام کے آٹھ بجے سے لے کر صبح کے چھ بجے تک گھر سے باہر نہ نکلے ورنہ گولی ماردی جائے گی۔''(۹)

اس افسانے میں جرم کی پاداش کی وجہ سے عوام کو یہ سزا دی گئی کہ وہ جلیانوالہ باغ کی طرف جانے والی گلی سے رینگ کر گزریں۔جبکہ یہ سزا خاصی کڑی تھی لیکن دو نوجوان اسے زندہ دلی کا ثبوت قرار دے کر شرط میں بدل دیتے ہیں اور گلی میں رینگنے کا مقابلہ کرتے ہیں۔غلام عباس نے سرمایہ داروں، اجاہ داروں اور طبقاتی استحصال، محروم و مجبور طبقوں کی مشکلات کی عکاسی خوبصورتی سے کی ہے۔یہی وجہ ہے کہ ترقی پسند نقطۂ نظر کے حامی غلام عباس سچی بات کو بہت آسان اور بے تکلف انداز سے کہہ دیتے ہیں۔بقول محمد حسن عسکری:

''غلام عباس کا وصف ہے کہ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں اسے کہہ ضرور دیتے ہیں، یہ نہیں ہوتا کہ کہیں کوئی کسر رہ جائے اور پڑھنے والا تشنگی محسوس کرے.....ان کے انداز میں بڑا توازن، اعتدال اور قرار پایا جاتا ہے۔بے حسی یا جمود ہرگز نہیں ہے۔''(۱۰)

غلام عباس نے زندگی کی ایک چھوٹی سی کاش کو موضوع بنانے کے بجائے زندگی کے وسیع تر اجتماعی احساس کو افسانے میں سمونے کی کاوش کی ہے۔افسانہ 'کتبہ' طبقاتی معاشرے میں پسے ہوئے ایک عام شخص شریف حسین کا المیہ ہے۔کہ کس طرح سے طبقاتی جبر شریف حسین کے خوابوں کو بکھیر دیتا ہے۔

''دفتروں کے رنگ ڈھنگ دیکھ کر وہ اس نتیجہ پر پہنچ گیا تھا کہ ترقی لطیفۂ غیبی سے نصیب ہوتی ہے، کڑی محنت جھیلنے اور جان کھپانے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔''(۱۱)

غلام عباس کا افسانہ 'اوور کوٹ' اردو کے معروف ترین افسانوں میں شمار ہوتا ہے۔یہ افسانہ ایک ایسے نوجوان کی کہانی ہے جو نچلے طبقے سے تعلق رکھتا ہے اور طبقاتی شعور کا شکار ہے۔لیکن زندگی بھر اعلیٰ طبقے میں شامل ہونے کے خواب دیکھتا ہے۔اس افسانے کا ہیرو اس طبقے کا نمائندہ ہے جسے داد عیش کے مواقع میسر نہیں ہوتے۔یہ افسانہ غریب کا رزمیہ والمیہ نہیں بلکہ ایک ایسا سفر ہے جس کا انجام تو المناک ہے لیکن انجام تک پہنچتے پہنچتے قاری حیران رہ جاتا ہے کہ چند لمحوں کے لیے ہی سہی زندگی کی مایوسیاں اور ناکامیاں خوش دلی کے روپ میں سامنے آجاتی ہیں۔'اوور کوٹ' ہمارے سماجی بہروپ یا خول کی ایک علامت ہے۔اس کے ساتھ ہی اوور کوٹ اس تصنع، فریب اور تضاد کی علامت بن جاتا ہے جو طبقاتی معاشرے

میں رہتے ہوئے خواہشات کی ناآسودگی کی وجہ سے انسان کے ظاہر و باطن میں پیدا ہو جاتا ہے۔

افسانہ 'سُرخ جلوس' بھی ایک سیاسی افسانہ ہے جس میں ہندوستان میں جلوسوں کی روداد کے علاوہ مغربی صحافیوں کی رپورٹنگ کا دلچسپ انداز سامنے آتا ہے اور جلسوں میں عوام کی بھیڑ چال کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔ یہ افسانہ غلام عباس کا ایک سیاسی طنزیہ افسانہ ہے۔ جس کے بارے میں ڈاکٹر انوار احمد لکھتے ہیں:

> '' 'سرخ جلوس' درحقیقت ایک طنزیہ ہے محض ہندوستان کے جلوسوں کے حوالے سے نہیں، مغربی صحافیوں کی رپورٹنگ سے ہی متعلق نہیں بلکہ ترقی پسند تحریکوں، رویوں اور نعروں کے بارے میں بھی اس افسانے میں طبقاتی کش مکش کو تاریخی قوتوں کے بطن سے نہیں، بھیڑ چال سے پھوٹتا دکھائی دیا گیا ہے۔''(۱۲)

افسانہ 'ایک دردمند دل' ایک محبِّ وطن نوجوان فضل کی افسردہ و غمگین کہانی ہے جو اپنے نوآزاد وطن کا جوش و جذبہ اور امنگ کے ساتھ ساتھ تعمیری منصوبے لے کر انگلستان سے لوٹتا ہے۔ فضل انتہائی جذباتی اور پرجوش قوم پرست ہے۔ وہ انگلستان میں اپنی محبوبہ روزی سے اپنے آزادی سے ہمکنار ہونے والے وطن اور اہل وطن کے ایثار محبت اور محنتوں کا ذکر جذباتی انداز میں کرتا رہتا ہے:

> ''روزی جب میرے ملک کو آزادی ملی تو میں وہیں تھا، میں تمہیں کیا بتاؤں کہ قومی ایثار و اوقات کے بعد بیلچوں سے نہریں کھودتے، پل بناتے، مہاجروں کے نئے جھونپڑیاں تیار کرتے، تعطیل کے دنوں میں استادوں اور طالب علموں کی ٹولیاں دیہات کا گشت کرتیں تاکہ دیہاتیوں میں، جنہیں ان کے پچھلے حکمرانوں نے مصلحتاً جاہل اور ان پڑھ رکھا تھا، تعلیم اور حفظانِ صحت کا پرچار کریں۔''(۱۳)

انگلستان سے واپس آکر فضل کو یہاں پر تلخ حقائق، نفسانفسی اور حوصلہ شکنی کا سامنا ہر قدم پر کرنا پڑتا ہے۔ لیکن آخر کار ان حالات کی تلخیوں اور محرومیوں کی وجہ سے وہ اپنے تعمیری منصوبوں سے دستبردار ہو کر 'بال روم ڈانسنگ' کھول دیتا ہے۔

غلام عباس کے افسانوں میں ماحول کی پیش کش ایک خاص زاویہ نظر رکھتی ہے جس سے نہ صرف افسانے کے تار و پود سامنے آتے ہیں بلکہ زندگی کے مسائل بھی ابھرتے ہیں۔ غلام عباس کے افسانے سماج کی ظالمانہ روایت، سماجی و سیاسی اور معاشی بے حسی کا عمدہ نمونہ ہیں۔ جن میں افسانہ 'سرخ گلاب' ناداروں و غریبوں کی مجبوریوں کا عکاس ہے۔ افسانہ 'بردہ فروش'، 'حمام' اور 'سیاہ سفید'، مزدوروں اور غریبوں کے استحصال کے ساتھ ساتھ عورتوں کے جنسی استحصال اور طبقاتی تضاد کا نمونہ ہیں اور افسانہ 'چکر' جبر کی کڑی دھوپ میں سختیاں برداشت کرنے والے مجبور و محروم طبقے کے داخلی مسائل اور بربریت کا نمائندہ ہے۔ غلام عباس کا معروضی انداز زندگی کی منافقت، ظاہر و باطن کے تضاد اور معاشرے کے متضاد پہلوؤں کو جس بالغ نظری سے بے نقاب کرتا ہے، اس سے ان کے مشاہدے کی وسعت، باریک بینی، ادراک حقائق اور فنکارانہ بصیرت کا اظہار ہوتا ہے۔

غلام عباس کی افسانہ نگاری کا سلسلہ قیامِ پاکستان کے بعد بھی جاری رہا ہے اور ان کے شاہکار افسانے سامنے آئے

ہیں۔ان میں ان کے اہم سیاسی افسانے 'لچک'، 'اوتار' اور 'دھنک' وغیرہ شامل ہیں۔اردو افسانے کے پاکستانی سرمائے میں ان دو نادر و نایاب افسانوں میں غلام عباس نے بھارتی مسلمانوں کی مخصوص تہذیبی اور سیاسی صورتحال کو اپنا موضوع بنایا ہے۔افسانہ 'لچک' غلام عباس کا سیاسی شعور کا بہترین مظہر ہے۔اس افسانے میں سیاسی طنز کی عکاسی کی گئی ہے اور لچک ایک ہی دینی اور سیاسی رہنما کی مختلف موقعوں پر کی گئی چار تقریروں پر مشتمل ہے۔بقول ڈاکٹر انوار احمد:

> ''لچک قوم پرست بھارتی مسلمانوں کی فکری پسپائی کا افسانہ ہے۔اس میں چار تقاریر ہیں۔وقت کے ساتھ ساتھ ان تقاریر کا بدلا ہوا لب ولہجہ اور الفاظ ہی وہ افسوسناک کہانی سنا دیتے ہیں جو سیکولر بھارت کی زبانی چھل بل چھپا نہیں سکتی۔''(۱۴)

یہ افسانہ بھارتی مسلمانوں کی دردناک صورتحال پر ایک موثر افسانہ ہے اور اس کا مرکزی کردار بھارتی مسلمانوں کی اجتماعی ہستی ہے۔ان کے اجتماعی مقدور کو درپیش چیلنج کو ایک 'قوم پرست' مسلم رہنما کے چار خطبات کے ذریعے اجاگر کیا گیا ہے۔یوں پورا افسانہ خطاب کی صورت میں سامنے آتا ہے اور سیاست دان جو کہ مسلم رہنما کی پہلی تقریر کا آغاز بسم اللہ اور آیات کریمہ سے ہوتا ہے۔اس تقریر میں مشترکہ قومیت کا پرچار کیا گیا ہے۔اس کے ساتھ ہی عربی اور فارسی الفاظ کا استعمال بھی جا بجا نظر آتا ہے۔جس میں مشترکہ قومیت کے پرچار کے لیے ان نکات پر زور دیا جاتا ہے:

> ''تقسیم ہند اب ایک حقیقت بن چکی ہے اور دو مملکتوں کا قیام بھی عمل میں آچکا ہے، مگر میں پھر بھی ڈنکے کی چوٹ پر کہوں گا کہ یہ تقسیم سراسر غیر فطری، خلاف حقیقت اور فتنہ انگیز ہے۔''(۱۵)

دوسری تقریر کا آغاز محض برادرانِ اسلام سے ہوتا ہے اور اس میں ہندوؤں کے مسلم کش رویوں کا ذکر نہایت خوبی سے کیا گیا ہے:

> ''ہندوستان آج بھی مسلمانوں کا ویسا ہی وطن ہے جیسا ہندوؤں کا ہے اور اس پر مسلمانوں کا بھی ویسا ہی حق ہے، جیسا ہندوؤں کا ہے۔ہمارے بعض ناسمجھ برادران وطن ہمیں مٹانے کے منصوبے بنا رہے ہیں۔ہماری دلآزاری کی جا رہی ہے۔شہروں، قصبوں اور دیہات میں فسادات روزمرہ کا معمول بن چکے ہیں۔''(۱۶)

تیسری تقریر میں ہندی الفاظ کی آمیزش نظر آتی ہے اور یہاں پر دوہرے لب ولہجہ کی وجہ سے بھارتی مسلمان کی شخصیت کی پیچیدگی کی عکاسی ہوتی ہے:

> ''ہم میں سے بہت سوں کی رگوں میں ہندو خون دوڑ رہا ہے اور اگر چھان بین کی جائے، تو اکثر مسلم خاندانوں کا شجرۂ نسب کسی نہ کسی ہندو گھرانے ہی سے جا ملے گا۔''(۱۷)

اور پھر چوتھی تقریر متر و تتھا دیش بھگتو! سے شروع ہو کر:

> ''سنار میں کرم ویر، دھرماتما تھا تیاگی و یکیتوں کا ابھاؤ نہیں ہے۔تدھے پی......تتھا......تتھا......''(۱۸)

کے فقرات پر ختم ہوتی ہے۔سیاسی رہنما کے فکر و عمل میں لچک جداگانہ مسلمان قومیت کے تصور کی انسانی معنویت کو روشن تر کر دیتی ہے۔اس افسانے میں فن اور سیاست باہم شیر و شکر ہیں اور یہاں غلام عباس کا فن ابھر کر سامنے آتا ہے اور وہی نرم مزاجی، سبک روی، کم بیانی، کفایت لفظی اور میٹھی طنز کی لہر جو ان کے افسانوں میں شروع سے لے کر اب تک موجود تھی مگر

یہاں پر بقول فتح محمد ملک:

'' 'لچک' میں ورائے فن چیز ے دِگر بھی ہے اور یہ ہے کہ سیاسی اور نظریاتی وابستگی۔''(۱۹)

افسانہ 'اوتار' بھی غلام عباس کے سیاسی شعور کا ترجمان ہے۔ اس کا موضوع بھی تقسیم کے بعد ہندوستان کو وطن کے طور پر قبول کرنے والے مسلمانوں پر ہندوؤں کا ظلم وستم ہے۔ اس افسانے کی کہانی فرقہ وارانہ فسادات سے شروع ہو کر فرقہ وارانہ فسادات پر مکمل ہوتی ہے۔ غلام عباس کا یہ افسانہ کئی لحاظ سے ممتاز تخلیق ہے۔ یہاں غلام عباس ایک ایسے زہر کے تریاق کا متلاشی ہے جس نے صدیوں سے بھارتی معاشرے کو فساد میں مبتلا کر رکھا ہے۔ پروفیسر فتح محمد ملک اس حوالے سے لکھتے ہیں:

''غلام عباس نے تجزیاتی انداز اپنا کر فرقہ وارانہ فسادات کی جڑیں مذہبی بالادستی کے جذبے میں نہیں بلکہ اقتصادی بالادستی کے جنوں میں پیوست دیکھیں، 'اوتار' میں ہر ہندو مسلم فساد کا بنیادی محرک کمزور قوم کی جائیداد، املاک اور وسائل پر قبضہ کرنے کی ہوس ہے۔''(۲۰)

افسانہ 'اوتار' تین حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں زمین گائے کے روپ میں مختلف دیوتاؤں کے پاس جا کر زمانے میں جاری ظلم وستم اور ناانصافیوں کی طرف ان کی توجہ دلاتی ہے اور دوسرے حصے میں سنبھل ضلع مراد کی ایک بستی کا منظر بیان کیا گیا ہے۔ جہاں مسلمانوں پر ظلم وستم ڈھائے گئے اور آخر کار مسلمان اس ظلم سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے ایک ویران جگہ جا کر آباد ہوئے ہیں لیکن وہاں بھی انہیں سکھ نصیب نہ ہوا اور دوبارہ فرقہ وارانہ کشیدگی سے فرقہ وارانہ فسادات جنم لیتے ہیں اور مسلمانوں کا قتلِ عام شروع کر دیتے ہیں۔ یہیں سے تیسرے حصے کا آغاز ہوتا ہے کہ ظلم وبربریت کے نقطۂ عروج پر آسمان وزمین لرزے اور وشنو مہاراج حمزہ کے روپ میں اوتار بن کر نمودار ہوا، اور قتل و غارت میں مصروف ہندوؤں کو شاستروں کے احکام وتعلیم سے روگردانی پر سرزنش کرتا ہے:

''کیا تم نہیں جانتے کہ دنیا کے تمام مذاہب ایک ہی مقصد رکھتے ہیں یعنی سفرِ آخرت۔ ہر شخص مسافر ہے اور اپنے طریق پر سفر کرتا ہے مگر منزل سب کی ایک ہی ہے اور ایک ہی روشنی ہے جو مختلف رنگوں میں نمودار ہوتی ہے مگر سب کے لئے مشعلِ راہ ہے۔''(۲۱)

غلام عباس کے ایک اور سیاسی افسانے 'دھنک' میں انھوں نے سیاسی جماعتوں اور ان کے سٹہ باز رہنماؤں کو طنز کا نشانہ بنایا ہے اور یہ افسانہ ایک فنطاسیہ ہے جو سیاست کے ہاتھوں مذہب کے استحصال کی عبرت ناک تصویر پیش کرتا ہے اور یہاں سیاست اور مذہب شروع سے آخر تک پس منظر میں رہتے ہیں۔ اس افسانے میں غلام عباس نے چھوٹے چھوٹے واقعات کے ذریعے کہانی بیان کی ہے۔ اس افسانے کا مرکزی کردار 'پاکستان' ایک ملک ہے اور انسانی کردار کو اس مرکزی کردار کے جزو کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ افسانے میں ایک ہوٹل 'موہن جوداڑو' کی محفل کی عکاسی کرتے ہوئے کہانی آگے بڑھائی جاتی ہے۔ معاشرے میں تبدیلیاں آتی ہیں اور ملاؤں کا حکومت کے خلاف ہنگامہ، ان کی حکومت قائم ہونا اور پھر معاشرے کی تباہی شروع ہوتی ہے۔ نیا معاشرہ تباہ ہو جاتا ہے اور آخر میں موہن جوداڑو کے آثار قدیمہ پیش کر کے تباہ شدہ معاشرے کی علامت کے طور پر سامنے آتے ہیں اور آخر میں اسی سے ایک نیا 'موہن جوداڑو' وجود میں آتا

ہے۔ گویا انھوں نے موجودہ سیاسی وجغرافیائی صورتحال کو اس خطے کی تاریخ وتہذیب کے ساتھ جوڑ کر پیش کیا ہے۔

غلام عباس اردو افسانے کی روایت میں اہم ترین نام ہے۔ ان کو اپنے عہد کے تقاضوں کا بھرپور شعور تھا اور غلام عباس کے ہاں صورتحال کا شعور دوسرے حقیقت نگاروں کی طرح پہلے سے طے شدہ نہیں ہوتا۔ ان کے فن کے متعلق ن۔م راشد لکھتے ہیں:

> ''غلام عباس ہی غالباً وہ واحد افسانہ نگار ہے جس کا فن انسانی زندگی کے رنگا رنگ مسائل کا احاطہ کرتا ہے جسے زندگی سے گہری محبت ہے۔ اتنی گہری محبت کہ وہ اس کے بخیے ادھیڑتا ہے، نہ اسے ننگا کرتا ہے نہ اپنی انا سے اسے مرعوب کرتا ہے بلکہ زندگی کو اپنا محرم راز جانتا ہے، اس سے سرگوشیاں کرتا ہے اور اس کی سنتا ہے۔''(۲۲)

ڈاکٹر سلیم اختر غلام عباس کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں:

> ''اتنا کم لکھ کر اتنا اچھا لکھا کہ اردو افسانہ کی کسی بھی نقطہ نظر سے بھی تاریخ کیوں نہ مرتب ہو وہ غلام عباس کے افسانہ کے بغیر نامکمل رہے گی۔''(۲۳)

غرض غلام عباس کے افسانوں میں اپنے عہد کے گہرے سماجی شعور کے ساتھ ساتھ سیاسی شعور بھی موجود ہے۔ اپنے سماج کی خرابیوں پر غور وفکر کرنے، ان سے نجات حاصل کرنے اور معاشی وسیاسی استحصال، ظلم کی مختلف صورتوں کو غلام عباس نے بہت خوب صورتی سے اپنے افسانوں میں بیان کیا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ جمیل جالبی، معاصر ادب، (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۱ء)، ص ۲۲۸

۲۔ سویامانے یاسر، غلام عباس، (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۵ء)، ص ۱۸۳

۳۔ فرمان فتح پوری، اردو افسانه اور افسانه نگار (لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۰۰ء)، ص ۱۰۹

۴۔ عبدالمغنی، تنقیدی زاویے، بحوالہ: ترقی پسند اردو۔ هندی افسانے کا تقابلی مطالعه، از: ڈاکٹر سیما صغیر، (علی گڑھ: مسلم ایجوکیشنل پریس، ۲۰۱۰ء)، ص ۱۵۰

۵۔ محمد صادق، ترقی پسند تحریك اور اردو افسانه، (دہلی: اردو مجلس، ۱۹۸۱ء)، ص ۲۰۶

۶۔ شہزاد منظر، علامتی افسانے میں ابلاغ کا مسئله، (کراچی: منظر پبلی کیشنز، ۱۹۹۰ء)، ص ۱۴۹

۷۔ ایم خالد فیاض، غلام عباس: فکر و فن، (راولپنڈی: نقش گر پبلی کیشنز، ۲۰۱۰ء)، ص ۲۰۰۔۲۰۱

۸۔ طاہر مسعود، انٹرویو: احمد ندیم قاسمی، مشمولہ: روزنامہ جسارت، (کراچی، ۲۵ جون ۱۹۸۲ء)

۹۔ غلام عباس، رینگنے والے، مشمولہ: غلام عباس: فکر و فن، ص ۳۲۸

۱۰۔ محمد حسن عسکری، انسان اور آدمی، (علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۷۶ء)، ص ۱۶۱

۱۱۔ غلام عباس، کتبہ، مشمولہ: آنندی، از: غلام عباس، (لاہور: مکتبہ جدید، ۱۹۴۶ء)، ص ۴۶

۱۲۔ انوار احمد، اردو افسانه: ایك صدی كا قصه، (فیصل آباد، مثال پبلشرز، ۲۰۱۰ء)، ص ۳۵۶

۱۳۔ غلام عباس، ایک دردمند دل، مشمولہ: جاڑے کی چاندنی، (کراچی: سجاد اینڈ کامران پبلشرز، ۱۹۶۰ء)، ص ۲۴۵

۱۴۔ اردو افسانه: ایك صدی كا قصه، ص ۳۵۶

۱۵۔ غلام عباس، لچک، مشمولہ: کن رس، (المثال پبلشرز، ۱۹۶۹ء)، ص ۱۰۹

۱۶۔ ایضاً، ص ۱۱۱ ۱۷۔ ایضاً، ص ۱۱۲ ۱۸۔ ایضاً، ص ۱۱۳

۱۹۔ فتح محمد ملک، غلام عباس اور نیا افسانہ، مشمولہ: تحسین و تردید، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۵ء)، ص ۶۶

۲۰۔ ایضاً، ص ۱۷

۲۱۔ غلام عباس، اوتار، مشمولہ: کن رس، ص ۸۷

۲۲۔ ن۔م۔راشد، دیباچہ: جاڑے کی چاندنی، ص ۱۶

۲۳۔ سلیم اختر، افسانه اور افسانه نگار، (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۱ء)، ص ۱۸